صفتِ رحمان سب صفات پر حاوی ہے، خدا کے رنگ سیکھیں اور اس سے حسن ظن کا تعلق قائم رکھیں۔

(خطبہ جمعہ فرمودہ 21 / اپریل 1995ء بمقام بیت الفضل لندن)

تشہد وتعوذ اور سورۃ فاتحہ کے بعد حضور انور نے فرمایا:

صفات باری تعالیٰ کا جو مضمون جاری ہے اس سلسلے میں ایک اہم قابل توجہ بات وقت محسوس کرنے والے کے ساتھ تعلق کا مسئلہ ہے۔ وقت کوئی ایسی چیز نہیں جو یکساں ہر صورت میں ہر ایک کے ساتھ ایک ہی طرح کے تعلق رکھتا ہو اور ایک ہی طرح کے احساس پیدا کرتا ہو۔ آپ مصروف ہوں کسی چیز میں اور بہت دلچسپی ہو تو آپ کا وقت آناً فاناً گزر جاتا ہے اور اگر ایسی جگہ بیٹھے ہوں جہاں طبیعت پر بوجھ ہو طبیعت کے خلاف، مزاج کے خلاف لوگ بیٹھے ہوں تو بعض دفعہ وقت گزرتا ہی نہیں ہے۔ پھر مصیبت زدہ کا وقت بہت آہستہ گزرتا ہے۔ فراق کے مارے ہوئے کا وقت بہت آہستہ گزرتا ہے اور وہ جو آرام محسوس کر رہا ہے یا جسے وصل کی راحت میسر ہے اس کا وقت بہت تیزی سے گزر جاتا ہے۔ لگتا ہے لمحے اڑتے ہوئے چلے جا رہے ہیں۔

تو سوال یہ ہے کہ اللہ کی ذات سے اس مضمون کا کیا تعلق ہے اور کیا خدا تعالیٰ کے لئے بھی زمانہ اسی طرح کے اثرات پیدا کرتا ہے یا فرق ہے۔ جہاں تک جذبات کے ہیجان کا تعلق ہے یہ فرق تو بہت واضح اور قطعی ہے اور حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بھی اس بارے میں بڑی تفصیل سے اور بڑی حتمی طور پر روشنی ڈالی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اندر وہ ہیجان نہیں ہے جو انسان اپنے

اندر پاتا ہے۔غم کے وقت بھی انسان کے اندر ایک ہیجان کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔خوشی کے وقت بھی انسان کے اندر ایک ہیجان کی کیفیت پیدا ہوتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ اس ہیجان سے پاک ہے کیونکہ ہیجان دراصل ذات کے اندر زمانہ گزرنے کو کہتے ہیں۔اگر کسی ذات کے اندر زمانہ گزرنے لگے تو وہ ہیجان ہے اور زمانہ ٹھہر جائے تو وہ اکتاہٹ ہے،طبیعت بے زار ہو جاتی ہے اور کہتے ہیں وقت نہیں گزرتا لیکن دراصل یہ اندرونی کیفیات ہی کے نام ہیں۔

پس حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام اس بارے میں بڑی قطعیت کے ساتھ اور اس وجہ سے کہ واقعۃً بہت اہم مسئلہ ہے،فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات میں ہیجان کا تصور جرم اور گناہ ہے۔ خدا تعالیٰ میں کوئی ہیجان نہیں ہے اور یہ اس لئے لازم ہے کہ اگر ہیجان ہے تو پھر وہ ایک فانی ذات ہے کیونکہ اس کے اندر پھر تبدیلیاں ہو رہی ہیں اور تبدیلیاں ایسے زمانے کو چاہتی ہیں جو کسی نہ کسی طرف کوئی کنارہ رکھتا ہے۔آغاز بھی ہوتا ہے اور انجام بھی ہوتا ہے اور اس کے مادے کی کیفیت ایک نہیں رہتی۔پس اس پہلو سے یہ بہت اہم مضمون ہے لیکن اس کے نتیجے میں پھر جو اور مسائل پیدا ہوتے ہیں اور بعض احادیث میں خدا تعالیٰ کی صفات جس طرح بیان فرمائی ہیں ان سے اس مضمون کا جو ایک قسم کا ٹکراؤ دکھائی دیتا ہے اس کا حل پیش کرنا ضروری ہے۔

جہاں تک ہیجان کا تعلق ہے اس کا جیسا کہ میں نے بیان کیا ہے زمانے گزرنے سے گہرا تعلق ہے اور اگر زمانہ نہ گزرے تو پھر انسان اور کچھ نہیں تو کھیل کود میں ہی مصروف ہو جاتا ہے اور کھیل کود سے وقت کو ٹالتا ہے۔آج کل جو ٹیلی ویژن دیکھنے کا رواج ہے یہ وقت کو تباہ کرنے کی ہی شکل ہے۔کوئی اچھا کام نہ ہو،کوئی دلچسپی کی بات نہ ہو،مصروفیت نہ ہو تو ایسا آدمی ٹیلی ویژن کے سامنے بیٹھا رہتا ہے یعنی وہ لوگ یا وہ قومیں جہاں یہ عام ہے ان کا یہی حال ہے کہ بچے بھی،بڑے بھی وہ ایک کام چھوڑ کر ٹیلی ویژن کے سامنے آ کے بیٹھتے ہیں اور ٹیلی ویژن کے سامنے آ کر بیٹھنا کئی قسم کی کہانیاں بیان کرتا ہے،کئی ان کہی باتیں ہمارے سامنے کھولتا ہے۔ایک بچہ جس کو پڑھائی میں دلچسپی ہے اور گہرا انہماک پایا جاتا ہے اور شوق ہے کہ وہ زیادہ نمبر لے وہ ٹیلی ویژن دیکھے گا بھی تو سرسری نظر سے،پاس سے دیکھ کر گزر جائے گا مگر اس کے پاس وقت نہیں ہوتا۔ایک شخص ہے جسے ایک اچھی مجلس مہیا ہے،بہت دلچسپ باتیں ہو رہی ہیں ایسے موقع پر ٹیلی ویژن کے بعض اچھے پروگرام بھی لگے ہوں

تو لوگ کہتے ہیں بند کرو، اس کو بند کرو، ختم کرو، ہمیں باتیں کرنے دو، بڑا مزہ آرہا ہے۔ تو یہ دراصل مختلف مزوں کے نہ ہونے یا وقت کے اچھے مصرف نہ ہونے کے نتیجے میں انسان کھیل کود کی طرف مائل ہوتا ہے۔

اس تعلق میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ (الانبیاء: ۱۷) کہ ہم نے آسمانوں کو اور زمین کو اور جو کچھ اس میں ہے اسے کھیل تماشے کے طور پر پیدا نہیں کیا کیونکہ کھیل تماشا متقاضی ہے کہ دوسری طرف وقت کا بہتر مصرف نہ ہو اور جہاں تک وقت کا تعلق ہے چونکہ خدا وقت کا خالق ہے، وقت کی مخلوق نہیں اس لئے وقت اس پر حاکم نہیں ہے، وہ وقت پر حاکم ہے اور اس پہلو سے جو چیزیں اس نے پیدا کی ہیں ان میں اگر اس کو بوریت ہو تو ان کو پیدا کیوں کرتا۔ ان چیزوں کو سنبھالنا، ان کی دیکھ بھال کرنا، ان کا انتظام کرنا کیونکہ وہ خود مالک وقت ہے اس کے لئے لازم تھا کہ ایسا کرتا کہ خدا کی ذات کے مطابق ہوتی، وہ اس کی شایان شان ہوتیں اور اگر وہ شایان شان ہوں تو کھیل شایان شان نہیں رہتی اور اس کے کھیل اپنے معنے کھو دیتی ہے۔

اس لئے میں نے آپ کے سامنے یہ ٹیلی ویژن کی مثال رکھی اور دوسرے کھیل کود کی مثالیں بھی آپ کے سامنے ہیں۔ اس بات کو خوب سمجھ لیں کہ کھیل کود ایک متبادل ہے وقت کے بہترین مصرف نہ ہونے کا، نہ ہو تو پھر انسان لہو ولعب میں مصروف ہوتا ہے اور اگر وقت کی قیمت ہو یعنی خود انسان نے بنایا ہوا اور اس وقت کے اندر اعلیٰ درجے کا کام کر رہا ہو تو پھر کھیل کود بالکل بے معنی اور لغو ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ کھیلیں بھی جو لعب کے ہلکے معنوں میں نہیں بلکہ بعض سنجیدہ معنوں میں سمجھی جاتی ہیں مثلاً ورزشیں ہیں جن سے صرف دلچسپی کا تعلق نہیں بلکہ صحت جسمانی کا تعلق ہے، ان کو آپ لعب ان معنوں میں نہیں کہہ سکتے جن معنوں میں عموماً لفظ لعب جاری ہے یا اطلاق پایا جاتا ہے کہ بالکل لغو اور بے معنی ہیں۔ مگر جب بہت اچھے اور اعلیٰ مصارف وقت کے موجود ہوں تو پھر وہ بامعنی کھیلیں بھی لعب اور لغو کھیلیں دکھائی دینے لگتی ہیں۔

ایک دفعہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانے میں قادیان میں کرکٹ کا ایک میچ ہو رہا تھا جس میں کافی بڑے بڑے قادیان کے بزرگ بھی شامل تھے اور صحابہؓ میں بھی شوق تھا بعض کو کرکٹ کھیلنے کا، اس لئے سب اس طرف چلے گئے اور بہت ہی جوش دکھایا گیا اور کرکٹ کے میچ سے

سب بہت ہی محظوظ ہو رہے تھے۔ تو ایک بچے نے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام سے پوچھا کہ ابا آپ نہیں کرکٹ کھیلنے جائیں گے یا دیکھنے جائیں گے۔ تو آپؑ نے فرمایا کہ بیٹا میں جو کرکٹ کھیل رہا ہوں وہ اور ہے، اس کی بات ہی اور ہے۔ پس لعب خواہ فضول نہ بھی ہو اگر اس سے بہتر مصارف انسان کے وقت کے ہوں تو وہ بامعنی فائدہ مند کھیلیں بھی بالکل بے معنی اور بے حقیقت دکھائی دیتی ہیں، ان کے چہرے پہ کوئی نور نظر نہیں آتا۔

تو اللہ تعالیٰ کی ذات سے متعلق قرآن کریم میں جو یہ گواہی ملتی ہے رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ (آل عمران:192) اس کا اسی آیت سے تعلق ہے وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ لاعب ہونے کی ہمیں ضرورت کیا ہے، ہم نے اس غرض سے تو نہیں پیدا کیا کہ اپنا وقت گزاریں۔ لعب کا اس کے سوا اور کوئی مقصد نہیں ہوتا اور لعب کا تعلق اس ذات سے ہوتا ہے جو لعب میں مصروف ہو اور اس کی دلچسپی اپنی ذات میں کسی کمی کو پورا کرنے کی وجہ سے ہوتی ہے اور بہت سے دوسرے ایسے انسان کے مصارف ہیں جن کا تعلق گرد و پیش بہت وسیع دائروں تک پھیل جاتا ہے لیکن لعب کا تعلق ہر شخص کی اپنی ذات سے تعلق ہے۔ اب آپ کہیں کہ دیکھو جی کرکٹ کھیلتے ہیں تو لاکھوں آدمی دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ فٹ بال کا میچ ہوتا ہے تو لاکھوں یہاں بھی ٹیلی ویژن پہ دیکھ رہے ہیں ان کے ساتھ تو سب کا تعلق ہے۔ مگر امر واقعہ یہ ہے کہ ہر ایک کا اپنی ذات کا لعب کا تعلق ہے۔ ہر اس شخص کا تعلق ہے جس کے وقت میں اس وقت کوئی اور بہتر چیز موجود نہیں ہے اس لئے خواہ کروڑوں بھی ہوں اور وہ کھیل نہ بھی کھیل رہے ہوں تب بھی اس کو دیکھنے کا بھی اس بنیادی فلسفے سے گہرا تعلق ہے کہ اگر وقت کا بہتر مصرف ہے تو ٹھیک ہے ورنہ پھر چلو کرکٹ کی کمنٹری سن لیتے ہیں یا فٹ بال کا میچ دیکھ لیتے ہیں، خود نہیں دیکھ سکتے تو ریڈیو ٹیلی ویژن کے ذریعے دیکھ لیں۔ تو یہ ساری دلچسپیاں وقت کے دوسرے اعلیٰ مصارف کے نہ ہونے کے نتیجے میں ہیں۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ جو بھی خدا کرتا ہے اس پر خوشی محسوس کرتا ہے یا تکلیف محسوس کرتا ہے یا غم محسوس کرتا ہے تو کن معنوں میں اور اگر وہ اچھی باتیں بھی ہیں لعب کے علاوہ بہت ہی اعلیٰ درجے کی مصروفیات ہیں تو سوال یہ ہے کہ ان مصروفیات کا خدا کی ذات میں ہنگامہ پیدا کرنے سے کیا تعلق ہے۔ زیرو بم پیدا نہ ہوں تو ہم خوشی محسوس نہیں کرتے، زیرو بم پیدا نہ ہوں تو ہم غمی محسوس نہیں

کرتے۔ تو اللہ کی ذات کا اور ہمارا اس معاملے میں کیا فرق ہے؟ یہ پہلو بھی توجہ کے لائق ہے اور اس کے نتیجے میں ہمیں جیسا کہ میں آگے جا کے بیان کروں گا ایک بہت گہرا سبق ملتا ہے۔

ہم جب خوشی محسوس کرتے ہیں تو کچھ پانے کے نتیجے میں کرتے ہیں اور جب غم محسوس کرتے ہیں تو کچھ کھونے کے نتیجے میں محسوس کرتے ہیں اور پانے کا احساس جو ہے اگر محرومی بڑی ہو تو اتنا ہی زیادہ دل میں ہنگامہ پیدا کر دیتا ہے اور کھونے کا احساس اگر غربت بہت ہو تو اتنا ہی زیادہ زیر و بم دل میں پیدا کر دیتا ہے اور ایک ہیجان سا برپا ہو جاتا ہے۔ تو اللہ کے ہاں نہ پانے کا یہ مفہوم ہے نہ کھونے کا یہ مفہوم ہے لیکن اس کے باوجود خوشی اور ایک معنے کا غم خدا کی ذات کے حوالے سے ہمیں احادیث میں ملتا ہے۔ پھر اس کے کیا معنے ہیں؟

ایک شخص جس کا سب کچھ ہو اور اس نے ہر چیز پر احاطہ کیا ہو، وہ کوئی چیز کھو سکے ہی نہ۔ اگر کوئی چیز اس سے ہٹ کر پرے جاتی ہے اور وہ باشعور ہے تو دراصل وہ کھو رہی ہے نہ کہ خدا کھو رہا ہے۔ اس لئے وہ اگر خدا کو مل جاتا ہے تو اس کے لئے خدا تعالیٰ کی خوشی سے مراد ایک نہایت اعلیٰ درجے کی Nobility کا منظر دکھاتا ہے ایک بہت ہی اعلیٰ اور Dignified خدا تعالیٰ کا ایک ردعمل ظاہر ہوتا ہے جو ان معنوں میں نہیں ہے کہ میں نے کچھ پالیا ہے، ان معنوں میں ہے کہ اس میرے بندے نے وہ پالیا جس سے وہ محروم ہو رہا تھا اور یہ جو احساس ہے یہ ہنگامہ پیدا نہیں کرتا بلکہ Nobility کے احساسات میں ایک قسم کا دوام پایا جاتا ہے اور اس سے بجائے اس کے کہ جذبات میں ہیجان پیدا ہو ایک ایسا لطف محسوس ہوتا ہے جو ارتعاش سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ اس کو ہم شرافت کا لطف کہہ سکتے ہیں۔

چنانچہ آپ پر اگر احسان کیا جائے تو آپ لطف اندوز ہوتے ہیں۔ مگر اگر آپ احسان کریں تب بھی لطف اندوز ہوتے ہیں اور احسان کرنے کا لطف اپنے اندر وہ ولولہ نہیں رکھتا جو احسان قبول کرنے کا لطف رکھتا ہے لیکن احسان قبول کرنے کا لطف عارضی ہے اور وقتی ہے۔ احسان کرنے کا لطف ایک دائمی لطف ہے۔ چونکہ اس میں زیر و بم نہیں ہے اور ہنگامہ نہیں ہے اس لئے شرافت کا لطف ہمیشگی کا معنی رکھتا ہے اور اس میں خلود کے معنے پائے جاتے ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ کا چونکہ ہم سے تعلق احسان کا ہے اس لئے جو احسان کا لطف ہم محسوس کرتے ہیں اس سے ملتی جلتی کوئی بات ہم سوچ سکتے

ہیں مگر احسان قبول کرنے کے نتیجے میں ایک غریب کی جو کیفیت ہوتی ہے بعض دفعہ وہ رو پڑتا ہے، بعض دفعہ خوشی سے چیخیں مارنے لگتا ہے، بے قرار ہو جاتا ہے کہ کس طرح میں اس احسان کا بدلہ اتاروں یہ اور کیفیت ہے اور احسان کرنے والا جو یہ کیفیات پیدا کرتا ہے وہ ان کیفیات سے بالا ہوتا ہے۔ اس کے اندر یہ ہنگامے نہیں ہوتے بلکہ بعض دفعہ وہ شرمندگی محسوس کرتا ہے کہ یہ کیوں اس قدر اہمیت دے رہا ہے اس بات کو اور اللہ تعالیٰ نے یہی Nobility انسان کو ان معنوں میں سکھائی کہ جب تم بھوکوں کو کھانا کھلاتے ہو، جب غریبوں کی خدمت کرتے ہو اور وہ شکریہ ادا کرتے ہیں تو یہ کہا کرو لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا (الدھر:۱۰)۔ یہ تو ہم اللہ کی خاطر کر رہے تھے، یہ عذر رکھ کر ان سے کہا کرو کہ ہمارا شکریہ ادا نہ کرو کیونکہ شکریہ جن معنوں میں وہ ادا کرتے ہیں اس سے ان کو ایک قسم کی تکلیف ہوتی ہے۔ درحقیقت ایک غریب زیر احسان آ کر جب شکریہ ادا کرتا ہے تو اس کے کئی مضامین ہیں، اس سے کئی مضامین پیدا ہوتے ہیں۔ تفصیلی طور پر چونکہ اس نکتے کی بحث نہیں اٹھا رہا صرف اتنا بتانا ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ جو ہمیں یہ فرماتا ہے کہ تم کہہ دیا کرو کہ مجھے شکریہ کی ضرورت نہیں ہے، دو وجوہات اس کی ممکن ہیں۔ اس سے بھی زیادہ ہو سکتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہمارے اندر Nobility پیدا کی جائے اور ہمیں سمجھایا جائے کہ تم جو نیکیاں کرتے ہو ان کے ادنیٰ ادنیٰ بدلے اس وقت نہ حاصل کر لیا کرو اور اگر ایسا کرو گے تو تمہیں نیکی میں ایک لطف آنا شروع ہو جائے گا۔

دوسرا یہ کہ جہاں تک جزا کا تعلق ہے وہ تو اللہ کی رضا سب سے اچھی جزا ہے اور اگر تم رضائے باری تعالیٰ کی خاطر نیکی کرو تو اپنا سودا تو تم نے بہت اچھی قیمت پر بیچ دیا، اس سے بہتر قیمت متصور نہیں ہو سکتی لیکن اس کے ساتھ تمہارا Nobility کا لطف اپنی جگہ قائم رہا یعنی بیک وقت دو باتیں ہاتھ میں آ گئیں وہ ویسے ممکن ہی نہیں ہیں۔ ایک انسان ایک سودے کو ایک دفعہ بیچتا ہے دوسری دفعہ نہیں بیچ سکتا اسی سودے کو کیونکہ وہ ہاتھ سے نکل گیا اور اللہ ہمیں دوہرے سودے بتاتا ہے۔ فرماتا ہے نیکی کیا کرو تو ایسا احسان کرو کہ اس کے بدلے میں کسی قسم کی جزا کی تمنا نہیں رکھنی بلکہ کسی کی نیکی کے بدلے میں بھی جو نیکی کرتے ہو وہ نیکی نہیں ہے اس لئے ایسی نیکی کرو کہ کسی نے تم پر احسان نہ کیا ہو پھر نیکی کرو۔ بڑی تفصیل سے یہ مضمون قرآن کریم میں پہلو سے روشن فرمایا گیا ہے۔

یہ ہمیں خدا کے رنگ سکھائے جا رہے ہیں، یہ صفاتِ باری تعالیٰ سے تعارف کروایا جا رہا

ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ بھی احسان کے لطف اٹھاتا ہے اور وہ احسان کا لطف جو اس بات سے بھی مستغنی ہو جائے جس پر احسان کیا جا رہا ہے اس نے محسوس بھی کیا ہے کہ نہیں بلکہ اس بات سے بھی مستغنی ہو جائے کہ وہ اس احسان کے بدلے کہیں بدی تو نہیں کر دیتا۔ وہ جو لطف ہے سب سے اعلیٰ درجے کا لطف ہے جس میں کوئی ہنگامہ نہیں ہے۔ وہ ایک کامل سکون کا لطف ہے اور اپنی ذات میں دوام رکھتا ہے۔ ایک اعلیٰ کردار کا انسان جب یہ رنگ پکڑ لے تو اس کو کہتے ہیں کہ اس نے خدائی رنگ پکڑ لیا۔ اب انبیاءؑ کو دیکھیں یہی بات تو ہے جو ان کو تقویت بخشتی ہے۔

آنحضرت ﷺ نے اہل مکہ پہ کتنے احسان کئے، اہل عرب پہ کتنے احسان کئے اور ناممکن ہے کہ ان احسانوں کا اور ان کے گہرے دائمی اثرات کا تصور بھی انسان باندھ سکے۔ اس کے باوجود مسلسل آنحضرت ﷺ کی دل آزاری کی گئی۔ آپؐ کو روحانی بدنی ہر قسم کے دکھ پہنچائے گئے۔ آپؐ کے سب پیاروں کی اذیت سے آپ کی ذات کی اذیت میں اضافے کئے گئے لیکن بڑے استقلال کے ساتھ آپ ﷺ کے پائے ثبات اسی طرح قائم رہے، ان میں کوئی لغزش نہ آئی اور ایک ذرّہ برابر بھی آپ ﷺ اپنے مقصد سے پیچھے نہیں ہٹے۔ کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ اس وجہ سے تھا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ پیغام تھا، امانت کا حق ادا کرنا تھا۔ لیکن کتنے ہیں جو یہ سوچ کر امانت کے حق ادا کر سکتے ہیں۔ امانت کے حق ادا کرنے کا تعلق محض اس احساس سے نہیں ہے کہ ہم خدا کو جوابدہ ہیں۔ امانت کا حق ادا کرنے کا تعلق انسان کی ذاتی شرافت اور نجابت سے ہے۔ وہ ہو تو پھر یہ ذمہ داری انسان ادا کر سکتا ہے اور شرافت و نجابت یہ چاہتی ہے کہ وہ احسان کرے اور باوجود اس کے کہ اس احسان کا بدلہ بدی سے دیا جائے تب بھی احسان کرنا اپنی ذات میں ایک نجیب کے لئے لطف بن جاتا ہے اور اس لطف سے وہ مزے اٹھاتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ دنیا کو خبر نہ بھی ہو تب بھی وہ اپنی ذات میں مگن رہتا ہے کیونکہ وہ Noble ہے، اس کے اندر اعلیٰ کردار ہے۔ یہ خدا کی شان ہے جو نبیوں میں اترتی ہے اسی لئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ خدا تعالیٰ کو اس بات کی کچھ بھی پرواہ نہیں کہ ساری کائنات اور جو کچھ بھی اس میں پیدا کیا گیا ہے وہ خدا تعالیٰ کے احسانات سے غافل ہو جائے اور بالکل بے پرواہ ہو جائے اور بالکل حمد نہ کرے۔ مخلوق کو یہ بتایا گیا ہے کہ تم ہوتے کیا ہو، تمہاری حیثیت کیا ہے، کہ تم خدا کی ذات میں کوئی فرق ڈال سکو، نہ تمہاری خوشی کوئی معنے رکھتی ہے، نہ کوئی تمہارا غم معنے رکھتا ہے۔ تم خدا کے سامنے جھکو نہ

جھکو، وہ ایسی عظیم ذات ہے کہ جب اس سے نیکی پھوٹتی ہے تو وہی اس کے لطف کا موجب ہے۔

پس آنحضرت ﷺ نے جہاں بھی خدا کی ذات کے حوالے کے ساتھ لطف کا مضمون باندھا ہے وہاں ہرگز یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ وہ ہماری طرح کا کوئی لطف ہے۔ یہاں تک کہ ایک جگہ آنحضرت ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ خدا ہنس پڑا، عرش پر خدا ہنس رہا تھا اس بات پر۔ ایک بیان کرنے والے نے کہا ایک موقع پر اللہ بھی آسمان پر اپنے ایک مہمان نواز مخلص بندے کے مچاکوں کے اوپر مچا کے لینے لگا۔ یعنی یہ وہ واقعہ ہے جبکہ ایک صحابیؓ آنحضرت ﷺ کے مہمانوں کی خاطر کہ وہ بھوکے نہ رہیں، اپنا اور اپنی بیوی کا کھانا ان کو پیش کر چکا تھا اور بچوں کا بھی وہی تھا۔ بچوں کو سلا دیا اور اس کے بعد پھر بھی چونکہ غریبانہ حالت تھی اس زمانے میں، یہ ڈر تھا کہ مہمان کے لئے کھانا کافی نہ ہوگا تو بیوی سے کہا کہ جب ہم کھانا شروع کرنے لگیں تو تم پلّو سے دیئے بجھا دینا تا کہ اندھیرے میں اس کو یہ نہ پتا چلے کہ میں بھی کھا رہا ہوں کہ نہیں کھا رہا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور یہ احساس دلانے کے لئے مہمان کو کہ میں بھی کھا رہا ہوں وہ خالی مچاکے لینے لگا۔ جس طرح کھانے کا مزہ آتا ہے بہت مزہ آیا کر کے آوازیں نکالتے ہیں بعض لوگ، تو عام طور پر نہ بھی نکالتے ہوں تو مہمان کو بتانے کے لئے کہ میں بھی شامل ہوں گویا کہ، انہوں نے ایسی آوازیں نکالنی شروع کیں۔ صبح جب نماز کے لئے حاضر ہوئے تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ رات ایک بندے کے مچاکے خدا کو اتنے پسند آئے، خدا کے ایک بندے کے مچاکے اس کو اتنے پسند آئے کہ عرش پر وہ بھی مچاکے لینے لگا (بخاری کتاب الحج) اور یہ بات خدا نے خود حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کو بتائی نہ یہ کہ اس نے کوئی اطلاع خود دی ہو۔ تو اب مچاکے لینا یا ہنسنا، بعض روایتوں میں جہاں تک میں نے دیکھی ہیں اس میں مچاکوں کا لفظ تو نہیں ملتا لیکن ہنسنے کا اور لطف اٹھانے کا ذکر ملتا ہے۔ تو سارے مضامین جو اللہ کے تعلق میں بیان کئے گئے ہیں وہ انسانی اصطلاحوں میں بیان کئے گئے ہیں مگر انسانی اصطلاحیں خدا کی ذات پر صادق نہیں آتیں۔ اگر کوئی بھی اصطلاح نہ استعمال کی جائے تو ہم سمجھ ہی نہیں سکتے کہ وہاں کیا ہو رہا ہے کیونکہ انسانی تجربے کی کوئی بات بھی تو خدا میں نہیں ہے جو اس پر صادق آ سکے۔ پس ہمیں سمجھانے کی خاطر بعض دفعہ قرآن بھی ایسی مثالیں بیان کرتا ہے، بعض دفعہ احادیث ایسی مثالیں بیان کرتی ہیں اور ان مثالوں کے نتیجے میں جو مومن بندے ہیں ان کے ایمان بڑھتے ہیں اور جو بیمار ہیں ان کے اندر بیماری پیدا ہوتی ہے۔ کہتے

ہیں دیکھو جی خدا ایسی باتیں کرتا ہے۔

چنانچہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے جو آریوں کے ساتھ مناظرے ہوئے ہیں وہاں بعض نہایت ہی بدخلق آریوں نے نہایت ہی گندی زبان قرآن کے متعلق استعمال کی کہ دیکھو جی تمہارے قرآن کے مطابق تو اللہ کے ہاتھ ہیں، اس کے پاؤں ہیں، وہ جہنم میں پاؤں ڈالے گا حدیث میں آتا ہے، اور خدا جہنمی ہوا، اس قسم کی بکواس اور گندی زبان استعمال کرتا رہا لیکن قرآن کریم ایسی باتوں پر بھی نظر رکھتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖۤ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ؕ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَيَقُوْلُوْنَ مَاذَاۤ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۘ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّيَهْدِىْ بِهٖ كَثِيْرًا ؕ وَمَا يُضِلُّ بِهٖۤ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۷﴾ (البقرہ: 27)

کہ اللہ تعالیٰ تو ایک مچھر کی مثال بھی بیان فرماتا ہے اور فَمَا فَوْقَهَا سے یہ مراد نہیں کہ جو اس سے بڑی چیز ہو، اس سے ادنیٰ، یہاں فوق سے مراد چھوٹے ہونے کے مضمون میں اس کا فوق ہے یعنی یہ چھوٹی سی ذلیل چیز تمہیں دکھائی دیتی ہے۔ اللہ تو اس سے بھی آگے جا کر جس کو تم حقیر ترین سمجھ سکتے ہو اس کی مثال بھی بیان کرتے ہوئے نہیں شرماتا۔ اس کا معنی میں نے پہلے بیان کیا تھا اصل معنی تو یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی کسی تخلیق میں کسی شرم کی وجہ ہی کوئی نہیں کیونکہ ہر تخلیق شاندار ہے۔ ہر تخلیق کو کنہ میں اتر کے دیکھیں تو آپ ورطۂ حیرت میں ڈوب جائیں گے، اتنا حیرت انگیز نظام تخلیق ہے کہ اس کے چھوٹے سے چھوٹے ذرے میں بھی کمالات کا ایک عالم پنہاں ہے، ایک جہان چھپا ہوا ہے۔ تو ایک تو یہ معنی ہیں۔

لیکن دوسرے معنی یہ ہیں کہ مثالیں جب خدا تعالیٰ بیان فرماتا ہے تو اس کے مختلف اثر پڑتے ہیں، جو بیمار لوگ ہیں ان کی مرض میں اضافے ہو جاتے ہیں، جو ایمان والے ہیں ان کے ایمان بڑھ جاتے ہیں اس لئے سمجھنے کی بات ہے کہ ان مثالوں کو کس طرح سمجھیں۔ پس وہ مثالیں جو اللہ تعالیٰ اپنے متعلق یا دوسروں کے متعلق قرآن کریم میں بیان فرماتا ہے ان کے اطلاق کا مسئلہ ہے۔ ایک مومن ان کا ایسے رنگ میں اطلاق کرتا ہے کہ اس کا ایمان بڑھتا ہے۔ ایک کافر ایسے رنگ

میں ان کا اطلاق کرتا ہے کہ اس کی بے ایمانی بڑھ جاتی ہے۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ گمراہ اللہ کرتا تو ہے مگر صرف فاسقوں کو گمراہ کرتا ہے کیونکہ ان کے اندر بیماری پہلے سے موجود ہے۔ اس لئے وہ بیماری اور زیادہ سنگین اور گہری ہو جاتی ہے جب وہ خدا کی کسی مثال کو نہ سمجھ سکے۔

تو اللہ تعالیٰ نے جو امثلہ قرآن کریم میں بیان فرمائی ہیں یا حضرت اقدس محمد مصطفی ﷺ نے جو اسماء باری تعالیٰ کے مضمون پر مثالیں بیان فرمائی ہیں ان کو اس شان کے مطابق سمجھیں جو شان خدا تعالیٰ سے تعلق رکھتی ہے اور خدا تعالیٰ کی ذات پر اطلاق پا سکتی ہے۔ ورنہ آپ تضادات کی دنیا میں کھوئے جائیں گے اور خدا میں کوئی تضاد نہیں اور اگر خدا میں تضاد نہ ہو اور آپ کے ذہن میں خدا کی ذات میں تضاد ہوں تو اتنا ہی آپ خدا سے دور ہٹ جاتے ہیں اس لئے یہ مضمون بہت ہی اہمیت رکھتا ہے کہ آپ اللہ کی ذات کے متعلق اپنے خیالات کو تضادات سے پاک کریں چنانچہ اس کی مثال ایک میں آپ کے سامنے رکھتا ہوں۔

آنحضرت ﷺ نے فرمایا!

عن ابی هريرة رضی الله عنه عن رسول الله ﷺ انه قال :قال الله عذوجل انا عند ظن عبدی بی و انا معه حيث يذكرنی و الله !الله افرح بتوبته عبده من احدكم يجد ضآلته بالفلاة ومن تقرب الی شبراًتقربت اليه ذراعا ومن تقرب الی ذراعا تقربت اليه باعا و اذا اقبل الی يمشی اقبلت اليه اهرول۔

(مسلم كتاب التوبه باب فی الحض علی التوبه)

اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے انا عند ظن عبدی بی میں اپنے بندے کے لئے اس کے ظن کے مطابق بن جاتا ہوں۔ اس حدیث کا میں نے پہلے بھی ذکر کیا تھا اب دوسرے تعلق میں بھی اس حدیث کا ذکر کر رہا ہوں کہ اللہ اپنے بندے کے ظن کے مطابق ہو جاتا ہے۔ پس ایک ہی مثال ہو وہ کئی قسم کے ظن پیدا کر سکتی ہے اگر اللہ کی ذات سے حسن کا تعلق ہے اور سچائی کا تعلق ہے تو اللہ اس بندے کے وجود میں، اس کے تصور میں، ایک حسین ذات کے طور پر جلوہ فرماتا ہے۔ اگر وہ تصور ناقص ہے تو پھر ایک

بیمار ذات کے طور پر، ایک کمزور ذات کے طور پر اس کے دل میں اترتا ہے حالانکہ خدا کی ذات میں کوئی تبدیلی نہیں ہے۔

تو دراصل بعض تبدیلیاں جو ہمیں دکھائی دیتی ہیں وہ مخلوق کی تبدیلیوں کے نتیجے میں ہیں ان کے حوالے سے ہیں۔ پس خدا کسی کو اچھا دکھائی دے رہا ہو تو اللہ فرماتا ہے میں اس کے لئے اچھا بن جاتا ہوں۔ کوئی کسی کو برا دکھائی دے رہا ہو تو اس کے لئے فرماتا ہے کہ میں برا بن جاتا ہوں۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ کی ذات ہمارے تصور سے پیدا ہوتی ہے۔ اب یہ ایک الگ مضمون ہے۔ اس لئے ان باتوں کو سمجھتے وقت تمام باریک راہوں سے واقف ہونا ضروری ہے ورنہ انسان کسی مقام پر بھی ٹھوکر کھا سکتا ہے۔ تصور میں ایک ذات بنائی جائے اور وہ تصور کی ذات بن کر اترے تو اس کے اندر کچھ بھی تبدیلیوں کی طاقت نہیں ہوتی لیکن اللہ تعالیٰ تصور کی پیداوار نہیں ہے بلکہ تصور کے مطابق سلوک فرماتا ہے۔ یہ دو مختلف باتیں ہیں۔ تو ذات وہی ہے جس میں کوئی تبدیلی نہیں خواہ اسے ہم اچھا سمجھیں خواہ برا سمجھیں، خواہ تھوڑا اچھا سمجھیں یا زیادہ اچھا سمجھیں، ذاتِ باری تعالیٰ میں کوئی تبدیلی نہیں لیکن ہمارا فانوس جو بدلتا ہے اس سے شمع کے رنگ بدلتے ہیں۔ فانوس کا شیشہ جیسا ہو، جس طرح گردش کر رہا ہو، جس شکل کا وہ بنا ہوا ہو، اس قسم کی روشنی کے تأثرات سارے ایوان میں پھیل جاتے ہیں۔

تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ حسن ظن کا تعلق انسان کی بھلائی اور بہبود کے لئے بے حد ضروری ہے اور اگر اس تعلق میں بدظنی پیدا ہو جائے تو واقعۃً انسان بہت سی خوبیوں سے محروم رہ جاتا ہے۔ اسی مضمون میں حضرت زکریاؑ کی دعا کا قرآن میں ذکر ملتا ہے۔ وہ دعا کرنے کے بعد، عرض کرنے کے بعد کہ میں ایسا ہو گیا، میں ایسا ہو گیا بچے کی امید نہیں، مدتوں سے تیرے حضور دعا کر رہا ہوں۔ پھر عرض کرتے ہیں وَّلَمْ اَكُنْۢ بِدُعَآئِكَ رَبِّ شَقِيًّا (مریم:۵) کہ اے میرے اللہ اتنی لمبی دعاؤں کے باوجود، باوجود اس کے کہ مجھے اپنے بچے کی کوئی ظاہری امید نہیں، میں ایسا بدبخت نہیں کہ تجھ سے دعا کرتے ہوئے مایوس ہو جاؤں۔ اب دیکھیں حسن ظن تھا جس نے اثر دکھایا ہے کہ اللہ فرماتا ہے کہ میرا بندہ مجھے سے بدظن نہیں ہو سکتا تو میں کیوں اس کے حسن ظن کو سچا نہ کر دکھاؤں۔ چنانچہ بلا تاخیر خدا تعالیٰ ایک بیٹے کی خوش خبری دیتا ہے اور بیٹا بھی ایسا جس کے نام کی کوئی مثال اس سے پہلے دنیا

نے نہ کبھی دیکھی نہ کبھی سنی اسْمُهٗ يَحْيٰى (مریم:8) س کا نام خدا نے یحییٰ رکھا اور فرمایا ایسا نام ہے کہ جیسے تیری دعا بے مثل تھی ویسے یہ نام بھی بے مثل عطا کیا جا رہا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ کے اوپر ظن رکھنا اور صحیح ظن رکھنا یہ دراصل حسن ظن رکھنے کے مترادف بات ہے، ایک ہی بات کے دو معنے ہیں۔ کیونکہ اسماء حسنیٰ ہیں اس کے۔ تمام اسماء حسین ہیں تمام صفات دلکش اور خوبصورت ہیں۔

پس جب میں کہتا ہوں حسن ظن، تو یہ مراد نہیں ہے کہ ہم بعض دفعہ کسی آدمی پر وہ برا بھی ہو تو حسن ظن کر لیتے ہیں کہ اچھا ہوگا۔ حسن ظن کے سوا کوئی ظن خدا پر ہو ہی نہیں سکتا اور اگر ہوگا تو پھر غلط ہوگا۔ اس لئے اسماء حسنیٰ نے بتا دیا کہ صرف حسن ظن ہی اس پر چل سکتا ہے اور کوئی ظن اس پر چل ہی نہیں سکتا اور جب حسن ظن ہوگا تو اللہ اسی حسن اور اسی شان کے ساتھ آپ پر جلوہ گر ہوگا۔ اسی طرح آپ سے حسن سلوک فرمائے گا اور جہاں ظن میں کجی آ گئی، اللہ کج تو نہیں ہو سکتا لیکن اس سے سلوک میں اسی حد تک فرق ڈال دیتا ہے اور یہ معنی ہے **انا عند ظن عبدی بی** کہ میں اپنے بندے کے ظن کے مطابق ہو جاتا ہوں۔

اب اس سلسلے میں جہاں آگے بڑھنا، قریب ہونا، دور ہٹنا، دوڑنا، ٹھہرنا یہ ساری مثالیں جو بیان فرمائی گئی ہیں، یہ اس پس منظر میں سمجھیں تو آپ کے لئے کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہوگی۔ آپؐ فرماتے ہیں جہاں بھی وہ میرا ذکر کرتا ہے میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں یعنی فاصلہ ہی کوئی نہیں ہے۔ یہ جو بیان فرمایا ہے یہ ایک بہت ہی اہم حکمت کی بات ہے۔ آئندہ حدیث کو سمجھنے کی چابی اس بات میں ہے۔ اب آنحضرت ﷺ کی عارفانہ شان اس بات سے ظاہر ہوتی ہے جو بات بیان کرنا چاہتے تھے ہو سکتا تھا کہ کسی کو اس سے غلط فہمی ہو جائے اس لئے پہلے غلط فہمی کے دروازے بند کئے ہیں پھر آگے چلے ہیں۔

پہلے فرمایا کہ جب وہ میرا ذکر کرتا ہے یا درکھو میں ساتھ ہوتا ہوں۔ میرے درمیان اور مخلوق کے درمیان کوئی فاصلہ ہے ہی نہیں۔ لیکن اب جو فاصلے کی باتیں کروں گا تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں کہیں ہوں اور کہیں نہیں ہوں۔ چنانچہ فرمایا میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں۔ خدا کی قسم خدا تعالیٰ اپنے بندے کی توبہ پر اتنا خوش ہوتا ہے کہ اتنا خوش وہ شخص بھی نہیں ہوتا جسے جنگل بیابان میں اپنی گمشدہ اونٹنی مل جائے۔ اب آپ یہ دیکھیں کہ ''خوش ہوتا ہے'' کا حوالہ ایک ایسے وجود کے تعلق میں

دیا ہے جس کا وہ سب کچھ ضائع ہو گیا جس پر اس کی زندگی کی بنا ہے اور جب ملا ہے، ایسا بھوکا انسان، ایسا پیاسا انسان، جو صحرا میں ایک درخت کے نیچے بیٹھا ہوا ہے، اسے جب وہ گم شدہ اونٹ ملا ہے یا اونٹنی ملی ہے تو وہ سب کچھ مل گیا جو اس کی زندگی کی ضرورت تھی، اس کے بغیر وہ رہ ہی نہیں سکتا تھا اور اس کی فنا تھی اگر وہ چیز نہ ملتی۔ اس کا وجود قائم نہیں رہ سکتا تھا اگر وہ اس کھوئے ہوئے کو نہ پاتا۔ اس پر جو اس کی خوشی ہے وہ ایک بے مثل خوشی ہے اور اللہ کی شان دیکھیں کہ اپنی مثال اس بندے کی سی بیان کرتا ہے، وہ بندہ جو توبہ کر لیتا اور گناہوں سے واپس خدا کی طرف آجاتا ہے۔ فرماتا ہے کہ اس کو پانے سے مجھے ویسی ہی خوشی ہوتی ہے جیسے ایک صحرا میں دھوپ میں درخت کے سائے تلے بیٹھے ہوئے انسان کو ہوتی ہے جو ستانے کے لئے سوتا ہے، آنکھیں کھولتا ہے تو اونٹنی غائب ہے، اس کا سارا سامان اس پر لدا ہوا ہے اس کے سفر کی ضرورت اس اونٹنی میں موجود، وہ اونٹنی ہو تو وہ سفر کر سکتا ہے۔ اس کا پانی اس کا کھانا پینا ہر چیز اس میں ہے۔ تو گویا اپنی جان کھو دی۔ وہ حسرت کے ساتھ بیٹھا ہوا دیکھ رہا ہے اس کا کچھ بھی بس نہیں تو اچانک اس کو وہ اونٹنی اپنی طرف آتی ہوئی دکھائی دیتی ہے، جیسی اس کو خوشی ملتی ہے اس کی زندگی کی ہر ضرورت مل گئی، اس کی جان اس کو دوبارہ مل گئی، اتنی خوشی ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ یہ مثال دے کر فرماتا ہے میرا بندہ جب توبہ کر کے میری طرف آتا ہے مجھے ویسی ہی خوشی ہوتی ہے حالانکہ اس کے جانے کا نقصان ہی کوئی نہیں تھا۔ خدا کی ذات کے ساتھ اس کا یہ تعلق نہیں تھا کہ اگر وہ نہ ملتا تو خدا تعالیٰ کا کچھ حصہ کھویا جاتا یا اس کی ذات کو کسی قسم کا کوئی خطرہ لاحق ہوتا۔

اللہ تعالیٰ تو یہ فرماتا ہے کہ ساری کائنات بھی اگر میری احسان فراموش ہو جائے اور مجھے بھلا دے تو مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تو یہ خوشی Nobility کی خوشی ہے۔ یہ نہایت ہی اعلیٰ، عظیم کردار کی خوشی ہے جس کی مثال ہمیں انسان میں مل ہی نہیں سکتی سوائے اس کے کہ قریب تر مثال انبیاءؑ میں ملتی ہے اور اس کا جانا کیا، اس کا واپس آنا کیا لیکن چونکہ اللہ محسن ہے اور اس کے احسان کا تقاضا تھا ایک ذرے میں بھی اگر کچھ دریافت ہو جائے۔ اس کو کچھ مل جائے تو اللہ کا یہ احسان ہے اس پر۔ گویا اللہ نے اس کو نہیں پایا اس نے اللہ کو پایا ہے اور طرز بیان یہ ہے کہ میں نے سب کچھ پا لیا۔ یہ بھی حسن و احسان کا ایک معراج ہے اس سے بالا حسن و احسان تصور ہو ہی نہیں سکتا۔ پایا اس نے جس نے خدا کو کھو کر سب کچھ کھو دیا اور خدا یہ کہہ رہا ہے کہ میں نے سب کچھ پا لیا، گویا میرا سب کچھ کھویا گیا تھا۔ یہ

جو لطف ہے اس میں کوئی ہیجان نہیں ہے۔ یہ ایک دائمی نجات کا لطف ہے۔ حسن و احسان کا ایک ایسا جلوہ ہے جسے ہمیشگی حاصل ہے اور ہمیشہ اسی طرح ہی یہ جلوہ خدا تعالیٰ کی مخلوقات پر ظاہر ہوتا رہتا ہے۔

پس جنتوں کا دوام بھی اسماء باری تعالیٰ پر غور کرنے سے سمجھ میں آتا ہے۔ کیوں خدا کے بعض ایسے بندے ہیں جن کے متعلق فرماتا ہے۔ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا (البقرہ:163) نعمتوں اور جنتوں میں ہمیشہ ہمیش رہیں گے کیونکہ اس سے پہلے اس دنیا میں انہوں نے اپنی صفات کو خدا کی ہمیشگی کی صفات کے قریب تر کر دیا تھا اور خدا کی ہمیشگی کی صفات اس کے حسن و احسان کی صفات کے ساتھ ایک جان ہیں۔ ایک ہی چیز کے دو نام ہیں اور یہ حسن و احسان عارضی چیزوں سے اتنا بالا ہے۔ وہ چیزیں جو وقت کی غلام ہیں کہ ان کے ہونے نہ ہونے سے اس کو کوئی فرق نہیں پڑتا یہ اپنی ذات میں جاری رہتا ہے۔ پس اگر آپ خدا کے ایسے محسن بندے بنیں کہ ہر ضرورت کو پورا کرنے پر آپ کو لطف آئے اور ایسا لطف آئے جیسے گویا آپ کی ضرورت پوری ہو رہی ہے۔ یہ پیغام ہے اس مثال کا جو سمجھیں تو پھر اسماء باری تعالیٰ پر غور کا کچھ لطف بھی ہے اور اسماء باری تعالیٰ پر غور سے فائدہ بھی ہے۔ ورنہ خالی زبان سے رٹ لینا کچھ بھی حقیقت نہیں رکھتا اور واقعہ یہ ہے کہ انبیاءؑ اسی سے طاقت پاتے ہیں، اسی سے ان کو استقامت ملتی ہے، ان کو احسان کا مسلسل لطف رہتا ہے۔ یہ نہیں کہ وہ بڑی مصیبت میں مبتلا ہیں۔ دنیا ان کو مصیبت میں مبتلا دیکھتی ہے لیکن اللہ کا قرب نصیب ہونے کی وجہ سے ان کو احسان کا لطف آتا ہے، ناشکری پر بھی احسان کا لطف آتا ہے کیونکہ اور بھی ان کی عظمتِ کردار ابھرتی ہے۔

ایک شخص احسان کرتا ہے اس کے احسان کا شکریہ ادا کیا جا رہا ہے۔ ایک شخص احسان کرتا ہے اس کے احسان کا شکریہ ادا نہیں کیا جا رہا۔ ایک شخص وہ ہے جس کو گالیاں دی جا رہی ہیں، اذیتیں پہنچائی جا رہی ہیں، تب بھی وہ احسان کر رہا ہے۔ اب ان کے لطف میں بڑا فرق ہے۔ وہ جو آخری صورت ہے اس کی کوئی مثال نہیں اور کوئی احسان کا مضمون اس کے ساتھ مماثلت نہیں رکھتا۔ یہ بلند ترین مضمون ہے احسان کا۔ یہ احسان اگر پیدا ہو جائے تو پھر آپ ذاتِ باری تعالیٰ کے اسماء کے قریب تر پہنچ جاتے ہیں یعنی جتنا بھی قریب ہونا خدا نے ہماری خِلقت میں مقدر کر رکھا ہے اس سے زیادہ ہم قریب نہیں ہو سکتے۔ مگر جب آپ اتنا قریب ہو جاتے ہیں تو پھر اللہ تعالیٰ کے فضل کے ساتھ آپ کو وہ خلود مل جاتا ہے جو جنت کی صفت ہے اور اہل جنت کو جنت میں عطا ہوگا کیونکہ صفات باری تعالیٰ کا

لطف ہر حال میں ان میں موجود ہے، ہر حالت میں وہ لطف اٹھا رہے ہیں کیونکہ وہ احسان اپنی ذات میں ایک ایسا حسن ہے کہ اس سے احسان کرنے والا خود بھی لطف اندوز ہوتا ہے بلکہ زیادہ لطف اندوز ہوتا ہے کیونکہ سب سے زیادہ حسن کو وہ جانتا ہے جس کے اندر سے حسن پھوٹ رہا ہے۔

اس تعلق میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے عالم الغیب کی ایک ایسی تفسیر فرمائی جس کی کوئی مثال آپ کو کہیں اس سے پہلے دکھائی نہیں دے گی۔ آپؑ نے فرمایا عالم الغیب کا مطلب یہ ہے کہ اللہ اپنی ذات کو، بس خود وہی جانتا ہے کہ میں کیا ہوں۔ ہر دوسرے سے غیب میں ہے۔ وہ اللہ سے غیب میں نہیں۔ تو جس کی نظر اپنے حسن پر ہمیشہ ہو اس کو لہو ولعب کی ضرورت کیا ہے کیونکہ حسن میسر ہو تو کسی اور چیز کی ضرورت نہیں رہتی۔ وقت اپنی ذات میں مجسم لطف بن جاتا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ جب فرماتا ہے کہ ہمیں لٰعِبِیْنَ کی ضرورت نہیں ہے کہ لٰعِبِیْنَ بن کر زمین و آسمان کو پیدا کرتے۔ تو دراصل خدا چونکہ حسن ہے اور حسن ہی کا مجموعۂ صفات ہے اس پہلو سے جب اس کی اپنے حسن پر نظر رہتی ہے تو ہر دوسری بدزیبی اور کراہت جو باہر سے دکھائی دیتی ہے اس کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی اور اس میں اس کا دوام ہے۔

پس حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک عجیب عارفانہ نکتہ ہمارے ہاتھوں میں تھما دیا اس پر غور کریں تو خدا تعالیٰ کی ذات وصفات اور ان صفات کا وقت سے تعلق سمجھ آجاتا ہے۔ وہ ایک ایسا حسن ہے جس پر کسی اور کی نظر نہ ہو تو تب بھی فرق نہیں پڑتا۔ وہ مجسم اپنے حسن میں مگن ذات ہے۔ اپنے حسن سے اس کا علاقہ ایسا ہے کہ اس کو کسی اور طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَا لٰعِبِیْنَ ہم نے جو کچھ بھی آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے اسے لاعب کے طور پر پیدا نہیں کیا یعنی اپنا وقت گزارنے کی خاطر کوئی بہتر مصرف نہیں تھا اور کوئی کام نہیں تھا اس لئے ہم زمین و آسمان کو پیدا نہیں کیا۔

لَوْ اَرَدْنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ لَهْوًا لَّاتَّخَذْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّآ ۖ اِنْ كُنَّا فٰعِلِیْنَ (الانبیاء: 18)۔ اگر ہم نے کوئی لہو پسند کی ہوتی تو ہماری ذات میں سب کچھ ہے۔ اپنی ہی ذات سے وہ چیز پیدا کرتے کسی اور کے حوالے کی ضرورت ہی کوئی نہیں تھی۔ پس یہ وہ غیب کو جاننے کا مضمون اس آیت کو سمجھنے میں ہماری مدد کرتا ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جب فرمایا کہ وہ غیب کو جانتا ہے۔ اول

معنی اس کا یہ ہے کہ اپنی ذات کو، وہ جانتا ہے۔ اس کے سوا اور کوئی نہیں جانتا۔ اس کی ذات کے کمالات کو خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ تو حسن کا یہ ادراک جو خدا کو ہے یہ اس کو ہر دوسری چیز سے مستغنی کر دیتا ہے اور حسن اپنی ذات میں ہی مگن رہتا ہے اس کو کسی اور کی تعریف کی بھی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

پس اللہ تعالیٰ کے اندر جو یہ ایک عظیم الشان صفت ہے اپنی خوبیوں میں مگن ہو جانا، اپنی خوبیوں سے لطف اندوز ہونا، یہی نجابت کی تعریف ہے، یہی شرافت کی تعریف ہے۔ اور اس کے بعد ان خوبیوں کو دکھا کر لطف میں اضافہ نہیں ہوا کرتا بلکہ لوگوں کو دیکھنے، تعریف کرنے، پسند کرنے، ناپسند کرنے سے یہ بالا ہو جاتی ہیں۔ ایسی صورت میں سچا نیک وہ ہے جس کو دکھاوے سے کوئی غرض ہی باقی نہ رہے۔ آنحضرت ﷺ کو اپنی کسی نیکی کے، کسی قسم کے دکھاوے سے کوئی غرض ہی نہیں تھی۔ کوئی اگر سمجھتا ہے تو اس کا اپنا فائدہ ہے اور اگر کوئی نہیں سمجھتا تو حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کا کبھی کوئی نقصان نہیں تھا۔ اس لئے اپنی ذات کو ابھار کر دکھانے کی آپؐ کو ضرورت پیش نہیں آئی۔

صرف ایک اس پہ اعتراض پیدا ہوتا ہے کہ پھر اللہ نے اپنی ذات کو کیوں دکھایا۔ چنانچہ احادیث میں ملتا ہے اور حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس حدیث کا حوالہ دیا ہے اپنے ایک ارشاد میں **کنت کنزاً مخفیاً فاحببت ان اعرف** اور دوسری جگہ فرمایا کہ میں کنز مخفی تھا، میں چھپا ہوا تھا مستور خزانہ تھا۔ **فاردت ان اعرف** تو میں نے چاہا کہ میں پہچانا جاؤں، دیکھا جاؤں اور اس کی کسی ذات کے دکھاوے سے تعلق نہیں کیونکہ خدا نہ بھی دیکھا جاتا تو اس کے ذاتی لطف میں کوئی فرق نہیں ورنہ یہ کیوں کہا کہ میں مخفی خزانہ تھا۔ مخفی ہوا ہی کیوں پھر؟۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس کے ساتھ ہی ایک اور حدیث بھی رکھ دی جس کے الفاظ یہ ہیں کہ میں نے چاہا کہ میرا خلیفہ بنے تو میں نے آدم کو پیدا کر دیا تا کہ وہ خلیفہ بن جائے۔ **اردت** میں نے ارادہ کیا یا چاہا ''**ان استخلف**'' کہ میں اپنا خلیفہ بناؤں ''**فخلقت آدم**'' پس میں نے آدم کو پیدا کیا تو دراصل اپنی ذات کی طرح کے ملتے جلتے وجود پیدا کرنا دکھاوے کی خاطر نہیں ہوا کرتے بلکہ احسان کا یہ بہترین انداز ہے۔ اسی لئے رحمان سے ہر قسم کی تخلیق پھوٹی ہے۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے ماں بچہ پیدا کرتی ہے تو اپنے جیسا پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہے، اپنے جیسا وجود یعنی خود بخود کائنات میں

خدا تعالیٰ نے ایسی حکمتیں رکھ دی ہیں کہ ہر چیز جو پیدا کرتی ہے اپنے جیسا ہی پیدا کرتی ہے یعنی ماں ارادۃً تو نہیں کرتی مگر ہوتا ایسا ہی ہے۔ اب جو اپنے جیسا پیدا کرتی ہے تو اس پر جو پیدا ہوا ہے اس کا کوئی احسان نہیں لیکن جس نے پیدا کیا ہے اس نے احسان کیا ہے مگر اس لئے نہیں کہ وہ بچہ اس کو پہچانے۔ بچہ نہ بھی پہچانے تب بھی وہ محسنہ ہی رہتی ہے۔ بچہ حسن کا بدلہ بدی سے دے تب بھی وہ محسنہ ہی رہتی ہے۔ پس پہچانے جانے کی خاطر ان معنوں میں نہیں اس کو پیدا کرتی کہ وہ اگر بچہ پیدا ہو اور اس پر پھر وہ احسان کرے اور اس کا پہچاننا اس کی ذات میں ایک اعلیٰ قدر پیدا کر دے یا لطف کا احساس بڑھا دے، ہرگز یہ مقصد نہیں ہوتا بلکہ اس کا تعلق چونکہ رحم سے ہے، رحمان سے ہے اس لئے اس کے اندر خدا کی وہ صفت جلوہ گر ہو جاتی ہے جو ماں کے حوالے سے ہمیں خدا کی صفت کو سمجھنے میں بھی زیادہ سہولت پیدا ہو جاتی ہے۔

چنانچہ ایک ماں کے متعلق جو آتا ہے کہ اس کا اپنی بہو سے اختلاف تھا، جھگڑا تھا اور بہو گندی اور ظالم عورت تھی۔ اس نے ہر طرح سے اذیتیں پہنچائیں لیکن اپنے بیٹے کی خاطر وہ صبر کرتی رہی یہاں تک کہ بہو نے اپنے خاوند سے کہا کہ اگر تم مجھ سے سچی محبت کرتے ہو تو اپنی ماں کا سر کاٹ کر میرے سامنے طشتری پر لا کے رکھو تب میں سمجھوں گی کہ واقعۃً تم مجھ سے محبت کرتے ہو تو اس ظالم نے یہی حرکت کی۔ اب یہ تو کہانی ہے مگر اس کہانی سے ہمیں اللہ تعالیٰ کی ذات کا کچھ عرفان نصیب ہو جاتا ہے اور اسی تعلق میں یہ بات ہے جو میں بیان کر رہا ہوں۔ کہتے ہیں جب وہ سر کاٹ کے لے جا رہا تھا تو اس کو ٹھوکر لگی اور طشتری سے وہ سر زمین پر جا پڑا، بچہ بھی گرا، اس سر سے آواز آئی میرے بچے تجھے چوٹ تو نہیں لگی۔ یہ ماں کا جذبہ دکھانے کے لئے کہانی بنائی گئی ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ جب فرماتا ہے کہ میں ایسا خوش ہوتا ہوں جیسے گم شدہ اونٹنی کسی کو واپس مل گئی ہو۔ تو دراصل یہی مضمون ہے۔ پس اعرف کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس کے بغیر خدا تعالیٰ کی کوئی حیثیت نہیں تھی بلکہ وہ اپنے جیسے وجود پیدا کر کے ان پر احسان کرتا ہے اور احسان کرنا ایک فطری چیز ہے جس طرح ماں کی فطرت میں بچہ پیدا کرنا ہے اور بچے کی تکلیف اس کو ہمیشہ تکلیف پہنچاتی ہے، بچے کی خوشی سے وہ ہمیشہ خوش رہتی ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کے اوپر ان مثالوں کا اگر اطلاق ہوتا ہے تو محض اس حد تک جس حد تک خدا کی شان ہمیں اجازت دیتی ہے کہ ان کا اطلاق کریں اور ان کے اطلاق کے بغیر مضمون کی سمجھ ہی نہیں آسکتی،

نہ سمجھایا جا سکتا ہے کیونکہ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ (الشوریٰ:12) اس جیسا ہے ہی کچھ نہیں ہم سمجھیں گے کیا اس کو؟ پس اس مجبوری کے پیش نظر یہ مثالیں بیان کرنی پڑتی ہیں اور ان مثالوں کے ذریعے خدا کا جو عرفان دل میں پیدا ہوتا ہے وہ ہمیں خدا سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کرنے کا اہل بنا دیتا ہے اور ہم اپنی زندگی کے مقصد کو پورا کرنے کے بہتر اہل بن جاتے ہیں۔ پس اس پہلو سے یہ مضمون کا سلسلہ محض کوئی علمی ذوقی سلسلہ نہیں بلکہ ہماری ایک اشد ضرورت ہے جس کے پیش نظر میں سمجھتا ہوں کہ ابھی مجھے کچھ عرصہ اس کو جاری رکھنا پڑے گا۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔